سو الفاظ کی کہانیوں کا مجموعہ

اُس کے نام

سیف الرحمن ادیب

اُس کے نام

بِسمِ

اللّٰہ

الرَّحمٰنِ

الرَّحیمِ

کتاب کا نام	اُس کے نام
مصنف	سیف الرحمن ادیبؔ
صفحات	87
کہانیوں کی تعداد	50
تاریخ اشاعت	19 جون 2020ء

انتساب

"اس"

کے نام جس نے

قلم

پکڑنا سکھایا اور کہا:

"لکھا کرو!"

فہرست

اظہار خیال

از

محترم جناب

محمد توصیف ملک صاحب

سیف الرحمنؔ ایک ایسا نام جو ادبی دنیا میں سو لفظی کہانی کے بہترین لکھاری کے طور پر جانا جاتا ہے۔اپنے نام کے ساتھ 'ادیب' لکھتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی تحریریں کسی ماہر ادیب کی عکاسی کرتی ہیں۔ایک ایسا ادیب جو سو لفظی کہانی میں سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا ہنر رکھتا ہے۔
سیف الرحمنؔ ادیب ایک ایسا لکھاری جو اپنی تحریروں میں مشاہدات،احساسات،جذبات کے ذریعے ایسی خوب صورتی سے موتی پروتا ہے کہ قاری دنگ رہ جائے۔ان کی تحریریں ہر اس موضوع پر ہیں جن کو پڑھنے کے بعد خیال آتا ہے کہ واقعی یہ تحریر سیف الرحمنؔ ہی لکھ سکتا تھا۔قلم پر ان کی گرفت اس بات کی شاہد ہے کہ ان کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرا ہے۔میں نے ان کی تقریباً ساری تحریریں پڑھی ہیں انہوں نے ہر اس موضوع پر لکھا جس پر لکھا جا سکتا تھا۔سیف الرحمنؔ نے مطالعہ اور مشاہدہ کے ذریعے اپنی ادبی صلاحیتوں کو مزید جلا بخشی ہے۔

انہوں نے جس تسلسل، استقامت اور ذمہ داری سے لکھا ہے اس کی جتنی تعریف کریں کم ہے۔کچھ ہی عرصہ میں سیف الرحمٰن نے سو لفظی کہانی کے میدان میں نام پیدا کر لیا ہے۔کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ ان کی تحریر پڑھنے کو نہ ملے۔ادبی حلقوں میں انہیں ایک معیاری اور مستند لکھاری تسلیم کیا گیا ہے۔سیف الرحمٰن ادیب فیس بک پر بھی مصروفِ عمل رہتا ہے۔خوب صورت خیالات اور کردار کا مالک یہ ادیب بہت مختصر وقت میں سب کے دلوں میں گھر کر گیا ہے۔

"اس کے نام" سو لفظی کہانی کے اس کتابی مجموعہ میں پچاس بہترین تحریریں شامل ہیں۔کچھ تحریریں انسانی ضمیر کو جھنجوڑتی اور کچھ سماجی ناانصافیوں کا ذکر کرتی نظر آتی ہیں۔سماجی پہلو، کتاب دوستی، دورِ جدید کی باتیں، ماں کی قربانیاں، انسانی عزت و تکریم ،انسانیت کا درد اور حکومتی نظام پر طنز کے تیر برساتی ان تحریروں میں سیف الرحمٰن ادیب نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔

میرے لیے بہت خوشی کی بات ہے سو لفظی کہانیوں کا جامع مجموعہ بہت جلد قارئین کے مطالعہ کے لیے تیار ہو گا۔اس کتاب میں شامل کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔

سچی بات ہے کہ ان کہانیوں کے مصنف پر رشک آتا ہے کہ انہوں نے کس خوب صورتی کے ساتھ ان پچاس موضوعات پر لکھا۔سادہ الفاظ کے ذریعے ان تحریروں میں ایسی جاذبیت اور دلچسپی پیدا کی گئی ہے کہ کوئی بھی تعریف کیے بنا نہ رہ سکے۔ بلاشبہ سیف الرحمنٰ ادیب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بہت معیاری اور پُر کشش کہانیوں کا مجموعہ تیار کیا ہے۔تمام کہانیوں میں بلا کی روانی، دلچسپی اور انفرادیت ہے۔سیف الرحمنٰ نے سو لفظی کہانیوں کے لیے ایسے موضوعات کا چناؤ کیا ہے جن کے مطالعہ سے ہماری زندگی میں انقلاب پیدا ہو گا۔دعا ہے کہ ان کا یہ سفر جاری و ساری رہے۔اللہ پاک ان کے قلم کو سدا بہار رکھے اور ان کے قلم میں مزید پختگی عطا فرمائے۔

محمد توصیف ملک

مدیر خصوصی ماہنامہ ''اثاثہ''
ضلع نارووال

تاثرات

از

محترم جناب

محمد اکمل معروف صاحب

جناب سیف الرحمن ادیب نام اور کام دونوں حوالوں سے ہی
ادیب ہیں۔
ان کی تحریر کردہ سو لفظی کہانیاں ایک ایسی دنیا میں بیٹھ کر لکھی
جاتی ہیں جہاں جذبات و احساسات کا پورا ایک جہان آباد ہے۔

وہ سماج کے جسم پر موجود زخموں کو ہر روز ایک نئے نشتر سے
صاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بظاہر تو یہ عمل بہت تکلیف
دہ ہے مگر علاج بھی اسی سے ممکن ہے۔

ان کے تخیل کی پرواز بہت بلند اور قلم کی کاٹ بہت تیز ہے۔ یہ
بات بھی حقیقت ہے کہ قلم سے نشتر کا کام لینا ہر ایک کے بس
کی بات نہیں ہے۔

میں خود بھی مختصر کہانیاں لکھتا ہوں مگر سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنی کسی کہانی کے منظر عام پر آنے سے زیادہ سیف الرحمن ادیب صاحب کی کہانی کا انتظار رہتا ہے۔

اتنے تسلسل کے ساتھ منفرد موضوعات پر روز ایک کہانی لکھنا بھی ان کی ادبی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

محمد اکمل معروف

(بچوں کے معروف لکھاری)

اظہار خیال

از

محترم جناب

وسیع الرحمن ہاشمی صاحب

جواں سال لکھاری سیف الرحمان ادیب کی سو الفاظ کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔یہ مختصر کہانیاں اپنی معنویت میں ہر گز بھی مختصر نہیں ہیں۔ آپ آٹھ نو صفحوں کا افسانہ پڑھ لیجئیے یا آدھے صفحے کی یہ سو الفاظ کی کہانی پڑھ لیجئیے ، بات ایک ہی ہے،وہ اس لئے کہ ادیب کہانیوں کی بُنَت کا فن خوب جانتا ہے۔ قدرت نے اِسے کہانی کے سمیٹنے کا فن وافر مقدار میں ودیعت کیا ہے۔اُن لوگوں کو خاص طور پر ادیب کا احسان مند ہونا چاہئیے جو کسی ناگزیر مجبوری کے تحت ادب کے لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتے، گویا ادیب کہانیوں کی مشعل جلا کرایسے ادب دوست افراد کے ذوق کو بہم تسکین پہنچا رہا ہے۔

آپ نے جِنوں، پریوں اور بھوت پریت کی فرضی کہانیاں ضرور پڑھ یا سُن رکھی ہوں گی۔

یہ مافوق الفطرت کہانیاں ہمارے کسی اندرونی تقاضے کو پورا کرتی ہیں، اس لئے دنیاکا ہر شخص ان کہانیوں سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھتا ہے۔ادیب کا قلم ایسی کہانیاں لکھتے وقت کُند ہوجاتا ہے۔ مگر جب اِس کے مشاہدے سے گزرنے والے کسی حقیقی کردار کی کہانی لکھنی ہو تو اس کا قلم جولانیوں پر اُتر آتا ہے اور کہانی گویا اپنے سارے حجابات اس کے سامنے اتار کر رکھ دیتی ہے ۔ آپ کو سو الفاظ کی اِن کہانیوں میں وہی دُنیا نظر آئے گی جو دُنیا صبح سے شام تک ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ آپ کو ان کہانیوں کے کردار بھی دیکھے بھالے اور برتے ہوئے لگیں گے ،اس لحاظ سے تو یہ کہانیاں پڑھ کر آپ کو کسی قسم کا اچھنبا نہیں ہوگا، مگر چونکہ ادیب کسی اخباری رپورٹر کی طرح صرف کسی واقعے کو لکھ دینا کافی نہیں سمجھتا وہ اپنے مشاہدے اور احساس کو ملا کر کہانی بُنتا ہے، اس لئے اِس کی کہانیاں آپ کو سوچنے پر مجبور کردیں گی اور آپ کی اندرونی کیفیات بدل کر رہ جائیں گی۔

میں توقع رکھتا ہوں کہ ادبی منظر نامے پر ادیب کا یہ مجموعہ اپنا حق وصُول کرے اور ادب دوست عوام بھی اس مجموعے کو زیادہ سے زیادہ پذیرائی بخشے،تاکہ ادیب کے قلم کا تسلسل ٹوٹ نہ جائے اور کہانیوں کی پھُوار اسِ کے نوکِ قلم سے یوں ہی ٹُوٹ کر برستی رہے۔۔۔۔!!

وسیم الرحمن ہاشمی

شاعر، مصنف

پہلی بات

از

مصنف

یہ شاید اگست کے آخری دن تھے یا ستمبر کی ابتداء تھی جب میں نے ایک سال تک اپنے ذہن میں رہنے والے ارادے کو بالآخر باہر نکالا اور پہلی سو الفاظ کی کہانی لکھی۔
یہ بات بہت مشکل ہے کہ کوئی بچہ پہلا ہی قدم سیدھا رکھے اور سیدھا چلتا جائے۔ مبتدی ہونے کی بناء پر پہلی ہی کہانی بے حد غیر معیاری تھی (جو کہ اس مجموعے میں شامل نہیں کی گئی) مگر اُس وقت میرے نزدیک وہ کوئی غیر معمولی کارنامہ تھا۔ آفرین ہے ان کو جنہوں نے اس کہانی پر بھی حوصلہ افزائی کی اور آگے بڑھنے کی راہ دکھائی۔ سب سے عجیب بات تو یہ تھی کہ کچھ دنوں بعد ستمبر کی پانچ تاریخ کو وہ کہانی روزنامہ "اسلام" کے صفحے "جھلمل" میں بھی شائع ہو گئی۔ اتنی زیادہ حوصلہ افزائی کے بعد اب پیچھے ہٹنا بہت غلط تھا۔
چنانچہ روزنامہ "اسلام" کے ساتھ ساتھ اپنے فیسبک پیج "سو الفاظ کی کہانی" پر بھی لکھتا رہا۔

شروع کی تقریباً ایک سو آٹھ کہانیوں میں سے پچاس کہانیوں کا انتخاب آپ کے سامنے ہے۔

میں دل کی گہرائیوں سے ممنون ہوں روزنامہ "اثاثہ" کے مدیر خصوصی محترم جناب محمد توصیف ملک صاحب کا،

بچوں کے معروف لکھاری محترم جناب محمد اکمل معروف صاحب کا اور اپنے مربی و مشفق محترم جناب وسیم الرحمن ہاشمی صاحب کا کہ انہوں نے میری خاطر اپنا بے حد قیمتی وقت قربان کیا اور اپنے انتہائی قیمتی کلمات سے نواز کر میری اوقات سے زیادہ حوصلہ افزائی فرمائی۔ ان کے علاوہ ان تمام محسنین کا جنہوں نے سوشل میڈیا پر نہ صرف میری پذیرائی کی بلکہ وقتاً فوقتاً رہنمائی بھی فرمائی۔

اللہ تعالی ان سب کو دنیا و آخرت میں اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین

اگر اس کتاب میں کہیں پر بھی کوئی بھی بات آپ کی طبیعت پر گراں گزرے تو اس کے لیے پیشگی معذرت!

اور اگر کوئی بات دل کو چھو جائے تو ہاتھ اٹھا کر ناتواں مصنف کے لیے رب لم یزل کے ہاں سے سوال بھی ضرور کیجیے گا۔

(کتاب کے آخر میں موجود "آخری بات" پڑھنا مت بھولیے گا۔)

طالب دعاء

سیف الرحمن ادیب

"کفن چور"

وہ ایک کفن چور تھا۔
ہر روز رات کو قبرستان پہنچ جاتا اور جو قبر بھی نئی نئی بنی ہوئی
نظر آتی اسے کھود کر کفن چرا لیتا۔
اس کی ایک عجیب عادت تھی۔ کفن اتارنے کے بعد لائٹ جلا کر
ایک مرتبہ مردے کے منہ کو ضرور دیکھتا۔
ایک مرتبہ رات کو اسی ارادے سے قبرستان گیا۔ ایک قبر
کھودی،
کفن اتارا
اور جیسے ہی مردے کے منہ پر روشنی ڈالی مردہ جاگ گیا۔ کفن
وہی پھینکا اور گھر بھاگ آیا۔
اس دن کے بعد سے آج تک اس نے کفن نہیں چرایا۔
وہ مردہ اس کا ضمیر تھا۔

عجیب

ٹھیک تین سال پہلے وہ ہر وقت
بے روزگاری کا رونا روتا رہتا تھا۔ میٹرک پاس تھا۔
اس کے علاوہ نہ کوئی سفارش تھی نہ کوئی خاص پیسہ تھا۔
سارا دن گھر میں پڑا رہتا تھا۔
کبھی کبھی والد کی ڈانٹ سن کر جوش چڑھتا تو یہاں وہاں سے ادھار لے کر کبھی چپس اور کبھی سبزی یا فروٹوں کا ٹھیلا لگا لیتا یا مزدوری کرنے چلا جاتا۔ مگر ایک ہفتے بعد پھر بے روزگار ہو جاتا۔
آج تین سال بعد ملاقات کرنے اس کے پاس گیا تو وہ اپنے آستانے میں کسی مرید کو بے روزگاری کا تعویذ دے رہا تھا۔

اس کے نام

"میں نے تمہیں بارہ کا پانا لانے کا کہا تھا اور تم چودہ کا لے آئے ہو۔

اندھے ہو کیا؟" ساتھ ہی وہ اسے گالیاں دینے لگا۔

وہ کوئی دس سال کا پھول جیسا نازک بچہ تھا۔یقینا والد کی حقیقی موت یا م"نشیاتی موت" نے اسے مکینک استاد کے حوالے کر دیا تھا۔

وہ اگر چہ غریب تھا، لاچار تھا۔مگر عزت نفس اس کے پاس بھی تھی۔

تبھی ایک گاڑی کے پیچھے چھپا آنسو بہا رہا تھا۔

ادیب اس کے لیئے کچھ بھی کرنے میں بے بس تھا۔ اسی لیئے آج کے سو الفاظ اسی کے نام کر دیئے۔

نایاب

وہ اسے مسلسل اپنے سینے سے چمٹائے بیٹھا تھا۔ ہر کچھ لمحوں بعد
وہ اس کا بوسہ لیتا۔ میں اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔
بس میں سفر کرتے ہوئے بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔
وہ میری سیٹ سے کچھ فاصلے پر اسے اپنے ہاتھوں میں کسی انمول
خزانے کی طرح بڑی مضبوطی سے پکڑے بیٹھا تھا جیسے کوئی اسے
اس کے ہاتھ سے چھین کر بھاگ جائے گا۔
شاید اسے اس سے بہت محبت تھی۔
موبائل اور کمپیوٹر کے اس دور میں کتاب سے اتنی محبت کرنے
والا وہ نایاب طالب علم مجھے حیران کر رہا تھا۔

قانون

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ "کروڑوں" کی چوری کرنے والا تھانے
آیا تو تھانے دار نے اس کی خوب مہمان نوازی کی۔
اچھی طرح خاطر تواضع کر کے پورے تھانے کا دورہ بھی کرایا اور
جاتے ہوئے ہر قسم کا کام کرنے کا وعدہ بھی کیا۔
دوسری مرتبہ ایک "ہزاروں" چوری کرنے والے کو لایا گیا۔
تھانے دار نے اس کو خوب مارا، اس کے جسم پر نشانات چھوڑ
دیئے، اس کی ہڈیاں توڑ دیں اور کہنے لگا کہ:
"تم کیا سمجھتے ہو؟ قانون سو رہا ہے؟" قانون سو رہا تھا یا جاگ رہا
تھا؟
فیصلہ آپ کیجیے۔

اعتراف

وہ بہت بڑا لکھاری تھا۔

اپنی ماں کے پاس بیٹھا موبائل میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں مسلسل جھکی ہوئی تھیں۔

جب وہ نہ بولا تو مجبوراً ماں کو پہل کرنی پڑی:

"بیٹا کیا لکھ رہے ہو؟"

وہ بولا: "آج کل لوگ سارا دن موبائل پر لگے رہتے ہیں، گھر والوں کو وقت نہیں دیتے، اس پر لکھ رہا ہوں۔"

"مگر بیٹا! کچھ لوگ تو پابندی سے گھر والوں کے پاس بیٹھتے ہیں۔"

اس نے کہا: "ہاں! مگر وہاں بیٹھ کر بھی موبائل میں مصروف رہتے ہیں۔

سچا لکھاری تھا۔ میں اس کی سچائی کا معترف ہو چکا تھا۔

انتقام

میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب مین روڈ تک بھی پہنچ گیا۔
میں سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اچانک ایک موٹر سائیکل میرے پہلو سے ہلکا سا ٹکرا گیا۔ میں نے فورا جواب دیا اور ڈرائیور کو ایک زبردست دھکا دیا۔ جب حواس بحال ہوئے تو پتہ چلا کہ میں روڈ کے درمیان میں چل رہا تھا۔
اسی دوران وہ لڑکا اٹھا، کپڑے جھاڑے، ہیلمیٹ اتارا اور ہاتھ جوڑ کر بولا: "معذرت سرکار!" اور ساتھ ہی خفیف سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ گاڑی پر بیٹھ کر چلا گیا۔
بڑا عجیب انتقام تھا۔ وہ
"طنزیہ مسکراہٹ" اور "معذرت سرکار"

تیسرا

پروفیسر صاحب دو بچوں کی "فضیلت" پر لیکچر دے رہے تھے
کہ:
"بہت سارے مسائل کا حل اسی میں ہے کہ دو سے زیادہ بچے
پیدا نہ کیے جائیں۔ ایسا کرنے سے بچوں کی پرورش آسان ہو
جائے گی اور بڑھتی آبادی پر بھی قابو پا لیا جائے گا۔
پوری دنیا آج اسی بات پر زور دے رہی ہے کہ "بچے، دو ہی
اچھے۔"
پیچھے سے ایک طالب کھڑا ہوا اور اس نے سوال کیا: "سر! ویسے
بہن بھائیوں میں آپ کا کون سا نمبر ہے؟" پوری کلاس میں
قہقہوں کی آواز گونج اٹھی جب پروفیسر صاحب نے کہا:
"تیسرا"

مجھے کیمرہ خریدنا تھا۔
میں کیمروں والی دکان پر چلا گیا۔ دکان میں کئی قسم کی کیمرے
تھے۔
کچھ بڑے تھے،
کچھ چھوٹے تھے،
کچھ سادہ تھے،
کچھ بہت خوبصورت تھے،
کچھ سستے تھے جبکہ کچھ کی قیمت بہت زیادہ تھی۔ مختلف کمپنیوں
اور برانڈز کے کیمرے میرے سامنے تھے۔
ایک کیمرہ سب سے الگ رکھا تھا۔ مجھے وہی پسند آیا۔ میں نے
دکاندار سے قیمت پوچھی تو اس نے کہا:
"آپ اسے نہیں خرید سکتے۔ یہ آپ کے لئے نہیں ہے۔"
"پھر کس کے لیے ہے؟"
"یہ امیروں کا کیمرہ ہے۔ غریبوں سے سفید پوشی کی چادر اتارتا
ہے۔"
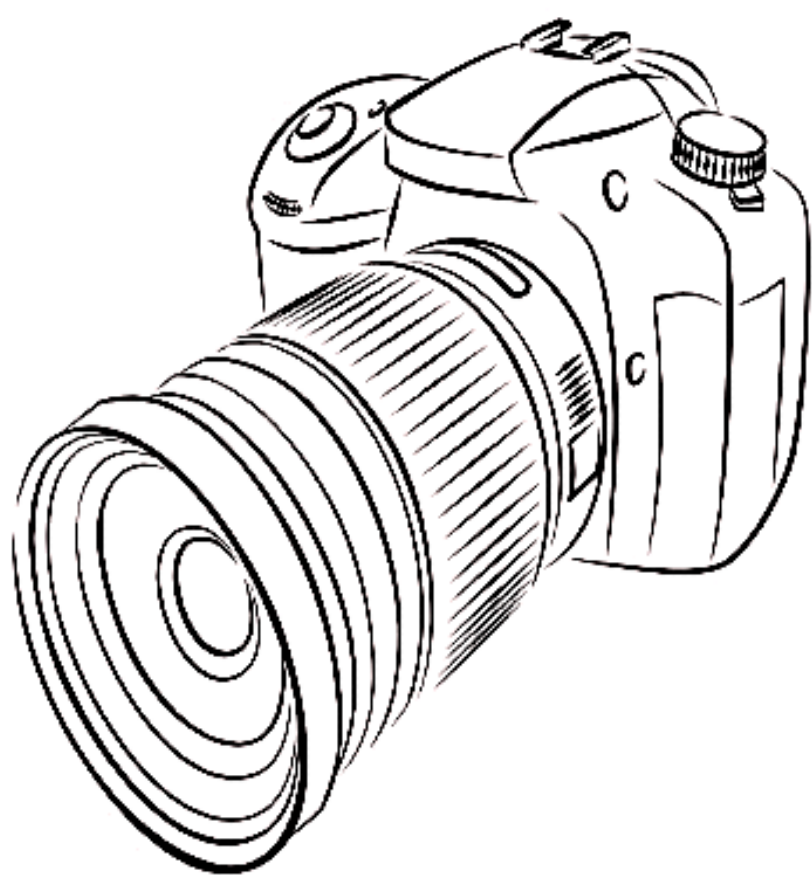
سو روپے

سبزی لے کر جیسے ہی مڑا تو دور سے رش نظر آیا۔ لوگ کسی
لڑکے کو مار رہے تھے۔ ہر ایک اس "کار خیر" میں حصہ لے رہا
تھا۔ لڑکے کی عمر کوئی پندرہ سولہ
سال تھی اور چہرے پر بہت سارے تھپڑوں کے بھی نشان
تھے۔
نظر آ رہا تھا کہ اس کی اچھی خاصی دھلائی ہوئی ہے۔ لوگوں کی
باتوں سے یہ معلوم ہو رہا تھا
کہ لڑکا کسی ٹھیلے والے کے غلے سے پیسے اٹھا کر بھاگنے کی کوشش
کر رہا تھا۔
"ویسے پیسے کتنے تھے؟" میں نے ایک صاحب سے پوچھا اور
جواب آیا:
"سو روپے"

سلیمانی ٹوپی

پرسوں رات عمرو عیار سے ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا:
"تمہاری سلیمانی ٹوپی بہت زبردست ہے۔ پہنتے ہی غائب ہو جاتے
ہو۔ پھر جو من میں آئے کرتے ہو۔ تمہارے تو بہت مزے
ہیں۔ میں یہ ٹوپی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔
کاش! میرے پاس سلیمانی ٹوپی ہوتی۔"
وہ ہنس کر کہنے لگا:
"تم بہت بھولے ہو۔ میرے پاس صرف ایک ٹوپی ہے۔
تمہارے ملک میں تو کئی سلیمانی ٹوپیاں ہیں۔"
"مجھے ٹوپی حاصل کرنے کے لیے کیا کرنا ہو گا؟"
"بہت آسان ہے۔ایم پی اے یا ایم این اے بن جاؤ۔ الیکشن
کے بعد خود بخود غائب ہو جاؤ گے۔"
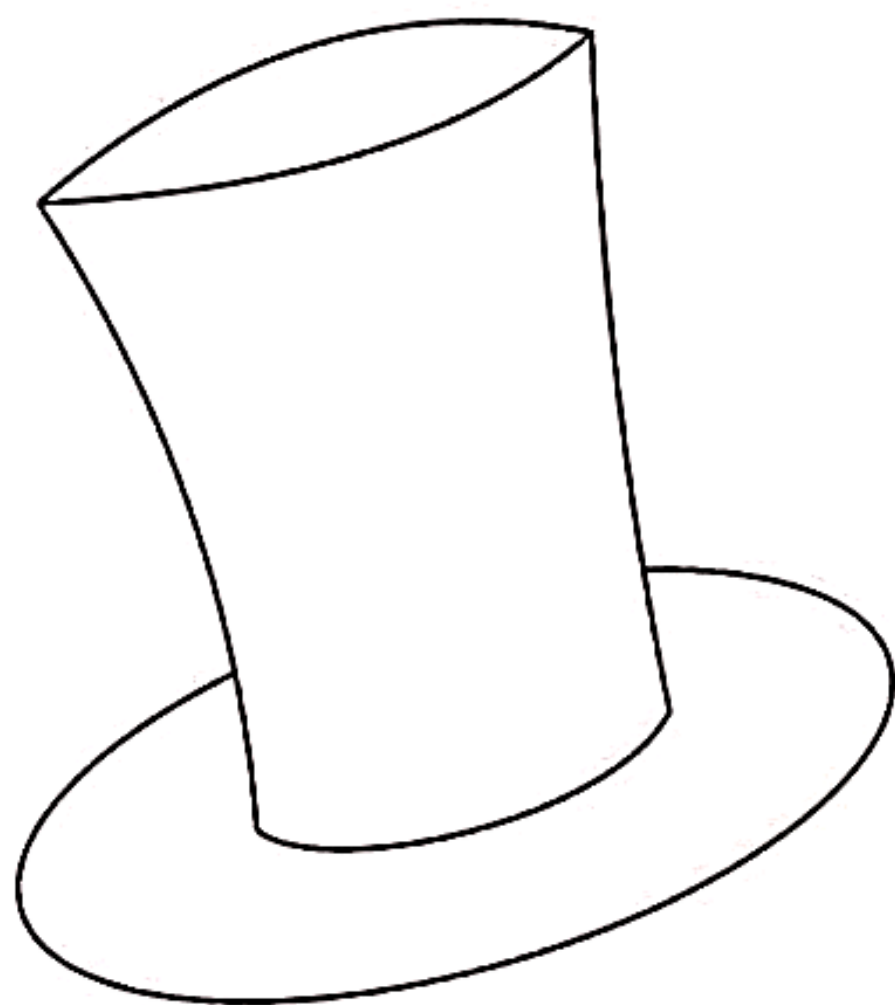
فرق

”نہیں نہیں! ٹھنڈا پانی آپ کی صحت کے لیے بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ پوری رات کھانستے رہتے ہو۔“

اس نے ماں سے سرد موسم میں ٹھنڈا پانی مانگا تو ماں نے جواب دیا۔

چند سال بعد جب وہ کچھ زیادہ ہی ”بڑا“ ہو گیا تھا تو اس کی ماں نے گرم موسم میں ٹھنڈا پانی مانگا۔

اس نے بددلی سے پانی دیا اور کہنے لگا:

”نہیں نہیں! ٹھنڈا پانی آپ کی صحت کے لیے بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ پوری رات کھانستی رہتی ہیں۔“

دونوں جملے ایک جیسے تھے مگر موسم اور لہجے کا فرق ساری کہانی بیان کر رہا تھا۔

ماں

"ماں! تمہیں سردی نہیں لگتی؟"
جب ماں نے اپنے اوپر سے پھٹا ہوا کمبل اتار کر اس کے گرد
اچھی طرح لپیٹا تو اس نے معصومیت سے سوال کیا۔"
نہیں بیٹا! میں بڑی ہوں نا۔ بڑوں کو سردی نہیں لگتی۔" ماں نے
بجتے دانتوں اور کانپتے ہونٹوں کے ساتھ جواب دیا۔ وہ سو گیا۔
سردی سے بے قرار ہو کر ماں نے اس کا بوسہ لیا تو آنکھوں سے
آنسو بھی نکل کر ہونٹوں کے ساتھی بن گئے۔
جاڑے کے موسم کی اس ادا پر میں بہت حیران ہوں۔
یہ ظالم صنف نازک کو بھی بہت سخت بنا دیتا ہے۔

عزت

"انسان کی عزت بہت زیادہ سستی ہو چکی ہے۔"
سفر لمبا تھا اسی لیے لکھنے کا سوچا۔ کہانی کا پہلا جملہ تھا:
"انسان کی عزت بہت سستی ہو چکی ہے۔"
اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ کنڈیکٹر ایک بزرگ سے لڑ رہا تھا۔
بابا جی کے پاس صرف تیس روپے تھے جبکہ کنڈیکٹر کہہ رہا تھا:
"پٹرول مہنگا ہو گیا ہے اسی لیے کرایہ پچاس روپے ہو گا۔"
بالآخر کنڈیکٹر نے بزرگ کو بس سے اُتار دیا۔
ادھر وہ بس سے اترے اور ادھر کہانی میں اضافہ ہوا:
"انسان کی عزت بہت ہی سستی ہو چکی ہے۔ بیس روپے سے بھی زیادہ۔"

ایفائے عہد

اس کا جواب سن کر میں اچھل پڑا۔
"میرے خیال سے اس مہینے بھی تمہارا پیسے واپس لوٹانے کا کوئی
پروگرام نہیں ہے۔"
"تم نے تو میرے دل کی بات کہہ ڈالی۔
اصل میں ہمارا ارادہ اس مہینے کے آخر میں ہماری یونیورسٹی میں
ہونے والے پروگرام میں ایک ٹیبلو پیش کرنے کا ہے۔اسی لیے
اس مہینے بھی . . ."
"یار تمہیں آٹھ مہینے ہو گئے مجھ سے ادھار لیے ہوئے اور ہر
مہینے تم اگلے ماہ کا وعدہ کرتے ہو۔
ویسے ٹیبلو کس موضوع پر ہے؟"
اس کا جواب سن کر میں واقعی اچھل پڑا۔
جواب تھا: "ایفائے عہد"

معقول

"معقول" تنخواہ کا لفافہ لے کر امام صاحب نے اپنی جیب میں ڈال دیا۔ مسجد سے گھر تک راستے میں یہی سوچتے رہے کہ ان آٹھ ہزار میں کیا کیا ہو گا؟
بیوی کی بیماری، بچوں کے کپڑے، مکان کا کرایہ، گیس اور بجلی کا بل یا مہینے بھر کا راشن؟
انہوں نے اپنے ایک دوست سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ اگلے دن اخبار لے آیا۔
"ضرورت ہے" کے تحت ایک اشتہار لگا ہوا تھا کہ "ایک مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔" مگر مسئلہ پھر بھی اپنی جگہ تھا کیوں کہ یہاں بھی تنخواہ "معقول" ہی تھی۔

عجب ہے!

شہر میں اچھا خاصا عرصہ مزدوری کر کے، پیسے جمع کر کے وہ
گاؤں جا رہا تھا۔ جیب میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔
اسی دوران بس کو لٹیروں نے گھیر لیا۔ تمام مسافروں نے
بندوقیں دیکھ کر سامان انہیں دے دیا مگر اس نے انکار کر دیا۔
وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔
تنگ آ کر ایک ڈاکو نے اس پر گولی چلا ہی دی۔ تھوڑی دیر تڑپ
کر وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ڈاکو سارا سامان لے کر چلے گئے۔
عجب تھا کہ گولی چلائی بھی اولاد کی خاطر گئی تھی اور کھائی بھی
اولاد کی خاطر گئی تھی۔

غیرت مند

اس کہانی میں میں کنڈیکٹر ہوں۔
پٹرول مہنگا ہونے کی خبر سنتے ہی میں نے سواریوں سے پانچ دس روپے اضافی لینے شروع کر دیئے جو کہ بالکل غلط تھا۔ بعد میں یہ پیسے میرے اور ڈرائیور کے درمیان تقسیم ہونے تھے۔
اسی دوران ایک لڑکا بس میں داخل ہوا۔
میلے کچیلے کپڑے، پراگندہ بال، کھلا ہوا گریبان، گندے جوتے اور ہاتھ میں پرانا تھیلا۔
"ہوں! بے غیرت بھکاری۔" میں نے نفرت سے منہ پھیر دیا۔
اچانک ایک باریک اور معصوم آواز آئی: "میٹھی ٹافیاں لے لو!"
اس کی کمائی بہت شفاف تھی۔
وہ مجھ سے زیادہ غیرت مند تھا۔

شمع

آج کا دن اس کی ماں کو بہت عجیب لگ رہا تھا۔
محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ ماں نے ماتھا چوم کر اپنی معصوم بیٹی کو پڑھائی کے لیے رخصت کیا۔
وہ اپنے ہاتھوں کو سوئیٹر کی جیب میں چھپا کر، مسکراتی ہوئی، اچھل کود کرتی ہوئی اور منہ میں "زندگی شمع کی صورت ہو خدا یا میری" گنگناتے ہوئے جا رہی تھی۔
اچانک اس کے کندھوں پر ایک بھاری ہاتھ لگا اور وہ "شمع" گل ہو گئی۔
سنا ہے کہ اس واقعے سے کئی سال پہلے انسانیت سسک سسک کر اپنا دم توڑ چکی تھی۔
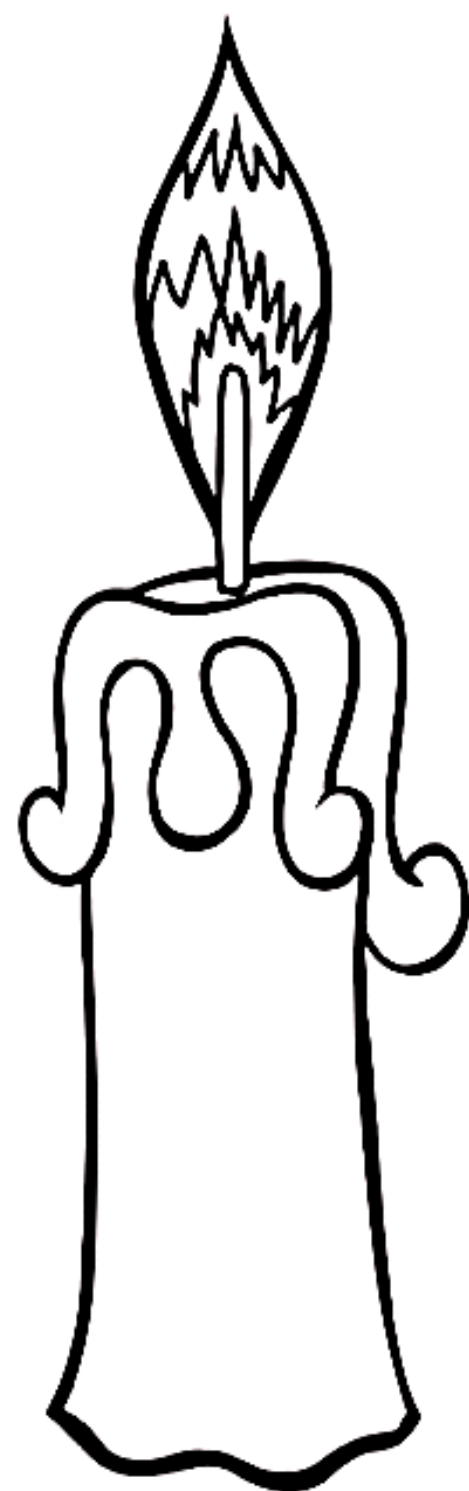
خاموشی

"ہائے اللہ بچاؤ! ماں بچاؤ! میرا ہاتھ ٹوٹ گیا۔"
بڑی بڑی لاٹھیاں اٹھائے وہ لوگ گھر میں گھس آئے۔ بہنا کی حفاظت کی خاطر ماں کا اکلوتا لخت جگر آیا تو لاٹھیوں نے اس کا سر پھاڑ دیا، ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے، خون بہنے لگا۔
جب بہن کا محافظ ناکارہ ہو گیا تو ظالموں نے بنت حوا کو نشانہ بنانے کا ارادہ کیا۔ وہ چیختی رہی، چلاتی رہی مگر سات براعظموں میں اس کی چیخوں کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔
ادیب کا قلم ہندوستانی بہن کی چیخوں اور ماں کی بے بسی کی ترجمانی کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

اس کی آخری سانسیں چل رہی تھیں۔
وہ بول نہیں سکتی تھی مگر اس کے خشک ہونٹ اعلان کر رہے تھے کہ اسے پانی چاہیے۔ مگر پانی ہونٹوں سے پینے کو کیا آنکھوں سے بہانے کو بھی نہ تھا۔ اطراف میں کھڑے گھر والے غم سے رونا چاہ رہے تھے مگر بھوکے پیاسے جسموں میں کہاں رونے کی سکت تھی؟
جنت نظیر وادی میں دور کہیں ایک پوتا رو رہا تھا کہ شاید کچھ آنسو مل کر اس کی دادی کے ہونٹوں کو گیلا کر دیں۔
الفاظ بہت کم ہیں۔
کشمیریوں سے یکجہتی کے لیے خون بہانا ادیب پر لازم تھا۔

دوسرا منظر

"کہاں جارہی ہو؟"
چودہ فروری کی صبح کو اس نے اپنی بہن سے پوچھا جو دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔
"وہ . . . . اپنی دوست کے پاس۔"
وہ تھوڑی دیر رک کر بولی اور ساتھ ہی موبائل بجنے لگا۔ کسی لڑکے کی تصویر اسکرین پر چمک رہی تھی۔
اگلے ہی لمحے "ڈھاز" کی آواز آئی۔
موبائل ٹوٹ چکا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ "اپنے والی" سے پوچھ رہا تھا:
"اتنا لیٹ کیوں آئی ہو؟"
"وہ بھائی جان نے روک لیا تھا۔"
"فون تو اٹھا لیتی۔"
"کیسے اٹھاتی؟
بھائی جان نے توڑ دیا تھا۔"
دوسرا منظر بھی اسی طرح کا تھا۔

خوف

وہ لکھاری تھا۔
اس کی خوفناک کہانیاں بہت مشہور تھیں۔
میز پر سر جھکائے وہ کہانی لکھ رہا تھا۔
اچانک اسے خوف محسوس ہوا۔ اور ساتھ ہی احساس ہوا کہ گھر میں بھی کوئی نہیں ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ کہیں سے کوئی سایہ نکل کر اسے مار دے گا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صرف خوف ہے۔
خوف نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ اس نے پوری زندگی لوگوں کو ڈرایا تھا آج وہ خود ڈر رہا تھا۔
کہانی کا آخری جملہ لکھ کر وہ کرسی سے نیچے گر گیا۔
"اور اسی خوف نے اسے قتل کر دیا۔"

مسلمان

کچھ مہینے پہلے ایک امریکی صحافی سے ملاقات ہوئی۔
وہ میرے اوپر رعب جھاڑنے لگا کہ
"امریکہ نے ساری دنیا کے انسانوں کے لئے عالمی قوانین بنا کر
بہت بڑا فلاحی کام کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ساری دنیا میں بچوں،
بوڑھوں، عورتوں اور مردوں کو ان کے حقوق مل رہے ہیں۔"
مجھے بے اختیار غصہ آگیا۔میں نے کہا:
"بس کرو! ساری دنیا جانتی ہے جو کچھ امریکہ نے عراق، شام اور
افغانستان میں کیا ہے۔"
وہ کہنے لگا: "وہ حقوق امریکہ نے انسانوں کے لیے بنائے تھے۔"
"تو شام اور عراق میں کون رہتا ہے؟"
"مسلمان"

جمہوریت

آج صبح ان سے ملاقات ہوئی تو کافی غصے میں تھے۔
کہنے لگے: "محلے کی مسجد کی کمیٹی کے لیے الیکشن ہوئے تھے
جس میں "صدر" کے لئے امام صاحب اور مؤذن کے علاوہ کچھ
نمازیوں نے مجھے ووٹ دیا۔
مگر محلے کے کئی لوگوں نے جنہوں نے کبھی نماز بھی نہیں پڑھی
اختر صاحب کو ووٹ دیا اور وہ صدر منتخب ہوگئے حالانکہ اختر
صاحب سے اپنا گھر تک نہیں سنبھلتا۔
مجھے ہنسی آگئی۔
یہ کونسی نئی بات تھی؟
جمہوریت میں تو یہ بات عام ہے۔
سو منصفین سے زیادہ معتبر ایک سو ایک ظالموں کا ووٹ ہوتا
ہے۔

طمانچہ

میں کراچی سے لاہور جا رہا تھا۔
ٹرین میں وہ میرے سامنے والی سیٹ پر شال اوڑھے بیٹھا تھا۔
اچانک اس کا نظر کا چشمہ نیچے جا گرا۔
اس نے مجھ سمیت کئی مسافروں سے چشمہ اٹھانے کو کہا مگر وہ چونکہ اس کے جوتوں کے پاس پڑا تھا اس لیئے کوئی تیار نہ ہوا۔
تنگ آ کر وہ خود اٹھا، نیچے جھک کر اپنے دانتوں سے چشمہ اٹھایا اور بولا:"یہ لو صاحب! مجھے پہنا دو میں دونوں ہاتھوں سے معذور ہوں۔"
اس کے ہاتھ نہیں تھے مگر وہ سب کے منہ پر زور دار طمانچہ مار گیا تھا۔
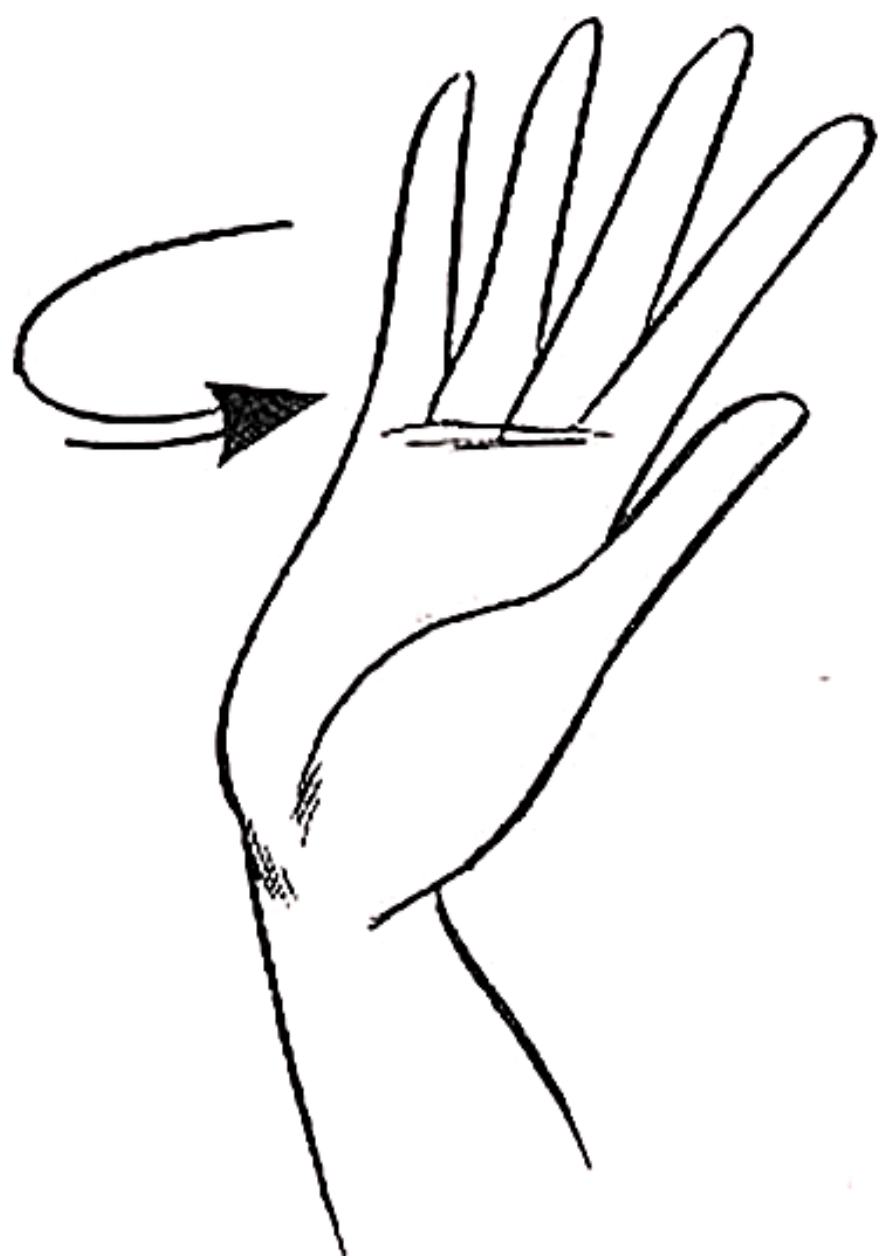
معمول

ہم دونوں اپنے اپنے موٹر سائیکل پر ایک ساتھ گلی سے نکلے اور
مین روڈ تک پہنچ گئے۔
چوک پر حسب معمول ایک ٹانگ سے وہ معذور آدمی کھڑا تھا۔
اس نے معذور آدمی کو اپنے ساتھ بٹھا دیا۔ یہ اس کا روز کا
معمول تھا۔اسی وجہ سے وہ دفتر تاخیر سے پہنچتا اور کبھی کبھار
ڈانٹ بھی سن لیتا۔
چائے کے وقفے میں میں نے اس سے یہ راز پوچھا تو کافی انکار
کے بعد بولا:
"میرے موٹر سائیکل خریدنے اور اس کے ایکسیڈنٹ سے پہلے
میں اسی چوک پر روزانہ اس کے انتظار میں کھڑا ہوتا تھا۔"

دس روپے

بچپن کی بات ہے۔
راہ چلتے اچانک دس کا نوٹ ملا۔
جھٹ سے اٹھا لیا۔ پہلو کھجانے کے بہانے جیب میں پھینک دیا کہ
کوئی دیکھ نہ لے۔
پھر تو جیسے عید ہو گئی۔پورے دس روپوں کا "مالک" بن کر خود
کو بہت امیر تصور کر رہا تھا۔ شام کو پکوڑے اور صبح کو اسکول
کے باہر "اچھو" کے چھولے کھانے کا سوچنے لگا۔
منہ میں پکوڑوں اور چھولوں کا ذائقہ محسوس ہونے لگا۔ خوشی
سے اچھلتا کودتا گھر پہنچا تو تسلی کی خاطر ہاتھ جیب میں ڈالا
اور........
ہاتھ دوسری طرف سے نکل آیا۔
جیب پھٹی ہوئی تھی۔

نیا دور

رات کا وقت تھا۔
سنسان سڑک تھی۔
اور میں پیدل چل رہا تھا۔
اچانک ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ میرے قریب آ کر رک گئی۔
گاڑی میں سے "ڈنڈا بردار" افراد نکلے اور میری طرف بڑھنے لگے۔ پچھلے سارے جرم میرے ذہن میں آ گئے جن کی وجہ سے مجھے یہ مار پڑ سکتی تھی۔ میں بھاگنا چاہتا تھا مگر ڈر نے مجھے جکڑ لیا تھا۔میری موت میرے سامنے تھی۔
ایک آدمی نے لاٹھی مجھے مارنے کے لئے بلند کی تو میری چیخ نکل گئی۔
وہ سب ہنسنے لگے۔
"گاڑی میں کیمرہ لگا ہوا ہے۔ ہم "پرینک" کر رہے تھے۔

ردی

ہمارے علاقہ شہر سے ذرا ایک طرف ہے۔ وہاں کوئی بڑا میڈیکل
اسٹور نہیں ہے۔
کالج سے واپسی پر کچھ دوائیں لینی تھیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ
میری جیب میں پیسے بہت کم تھے اور دوائیں لینا لازمی تھا۔
میں نے میڈیکل اسٹور والے کو کہا:
"میں روزانہ یہاں سے گزرتا ہوں۔ آج دوائی دے دیں۔ پیسے
کل لے لینا۔"
"ٹھیک ہے۔ مگر کچھ گروی رکھوالو!"
میرے بستے میں اشتیاق احمد مرحوم کا ایک ناول موجود تھا۔ میں
نے ناول آگے بڑھایا تو جواب ملا:
"کوئی اچھی چیز گروی رکھواؤ! یہ تو بیس روپے کی ردی بھی نہیں
ہے۔"
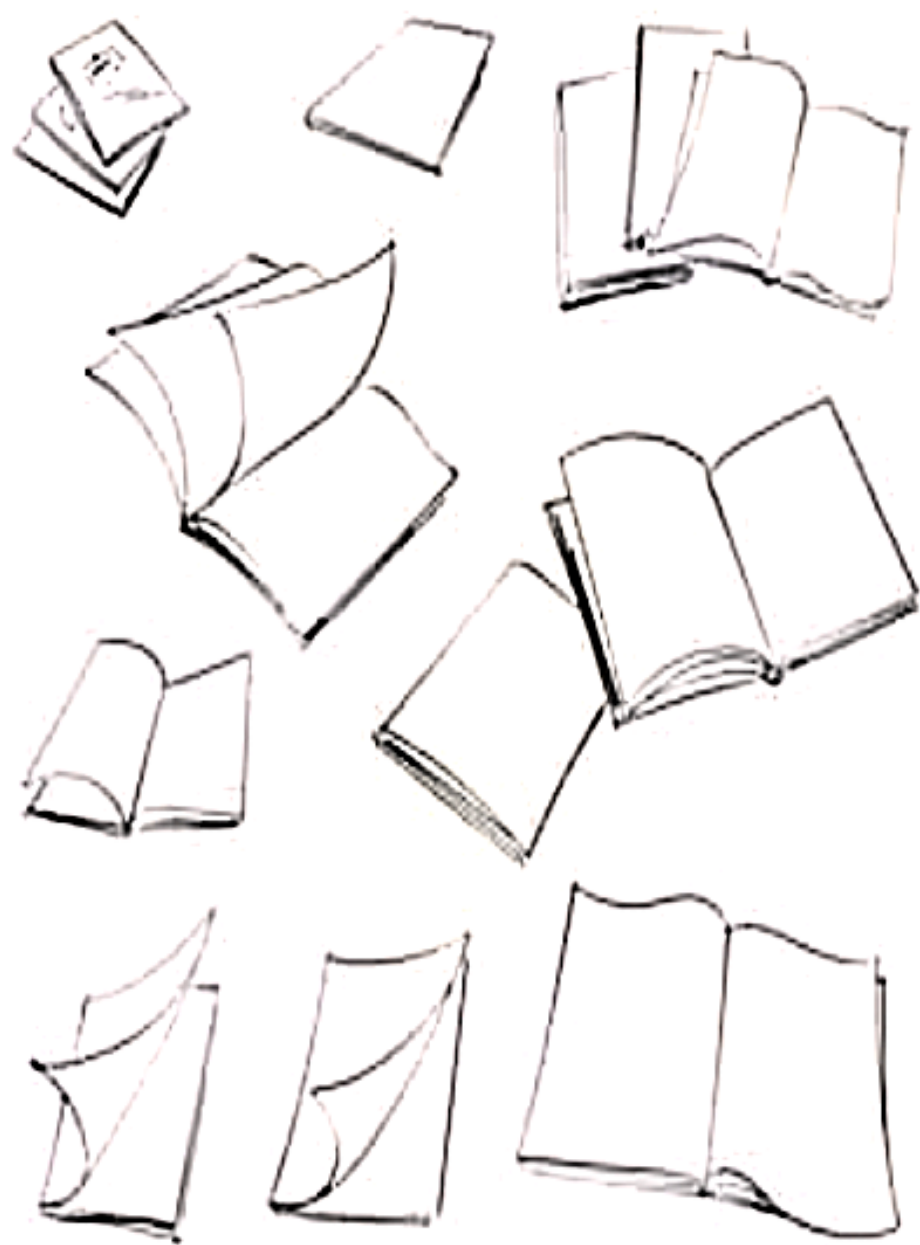
مکافاتِ عمل

"تم کسی کام کی نہیں ہو۔ ماں نے کچھ سکھا کر نہیں بھیجا کیا؟"
اس نے دو مہینے پہلے ہی گھر کے سارے کام سکھا کر بیٹی کو
رخصت کیا تھا۔ اور جلد ہی بہو بھی لے آئی تھی۔
وہ گھر کے کام اچھی طرح کرتی مگر ساس کے طعنوں نے اس کی
قوت چھین لی تھی۔
ادھر دوسری طرف بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ بہو ساس کو ایک آنکھ
نہ بھاتی۔
کہانی جس طرح شروع ہوئی اسی طرح ختم ہو گئی۔
بس منظر الگ تھا۔
"تم کسی کام کی نہیں ہو۔ ماں نے کچھ سکھا کر نہیں بھیجا کیا؟"

دو صدیوں بعد

بہت سخت مقابلہ ہوا تھا۔

لاکھوں سے ہزاروں،

ہزاروں سے سینکڑوں،

سینکڑوں سے درجنوں اور

اب درجنوں کے بعد تین ہی امیدوار میدان میں کھڑے تھے۔

ہزاروں لوگ میدان میں اور کروڑوں لوگ انٹرنیٹ پر انہیں
حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر ان تینوں کے لیے انعامات لائے گئے۔ شیشے کے مرتبان میں
کوئی عجیب سی شئے تھی۔

کچھ مٹی،

لکڑی کا ایک ٹکڑا اور

اس پر ہرے رنگ کی کوئی چیز لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب نے
مجھے دیکھ کر کہا:

"بیٹا انہیں درخت کہتے ہیں۔
پرانے زمانے میں یہ مفت میں آکسیجن فراہم کیا کرتے تھے۔"
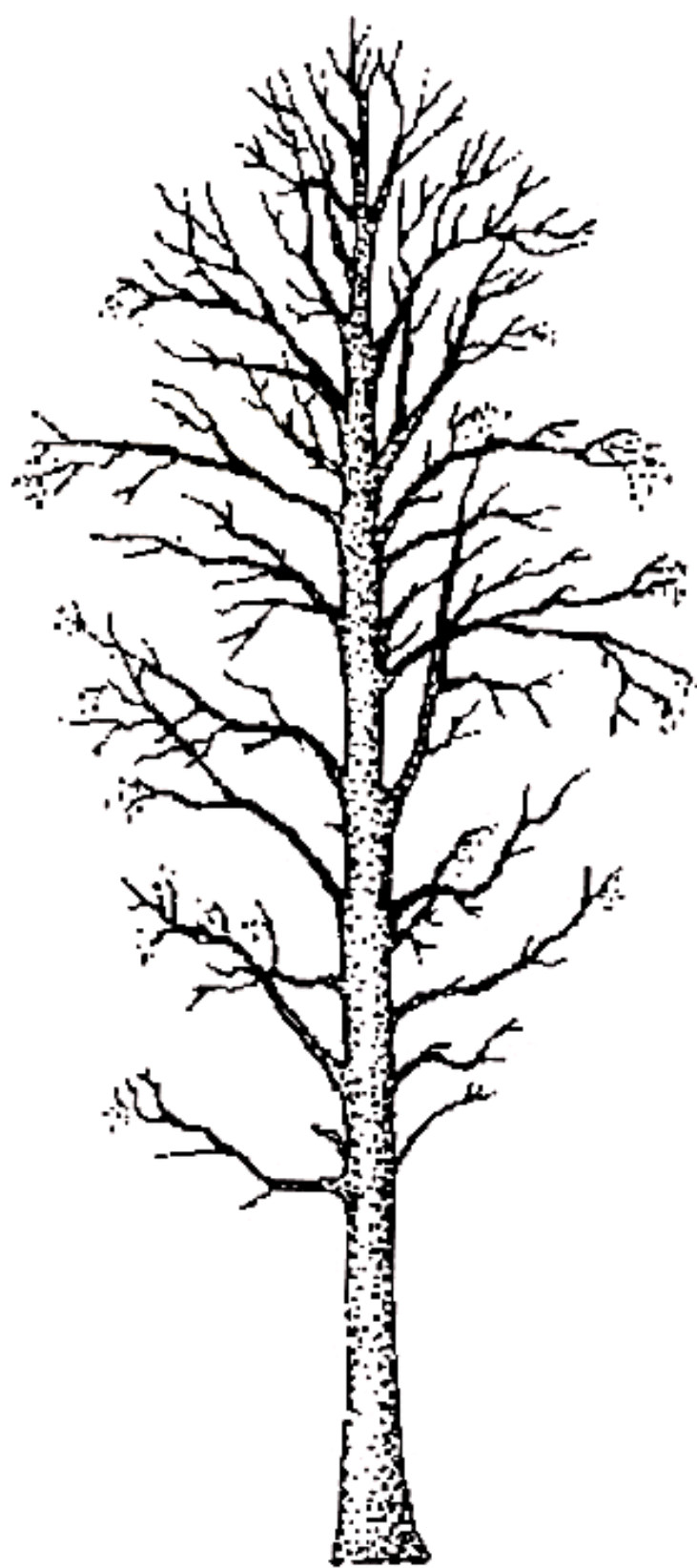
تنخواہ

سب دوست اپنی اپنی تنخواہ بتا رہے تھے۔
پروفیسر صاحب کی تنخواہ ڈیڑھ لاکھ تھی۔
وکیل صاحب بھی مہینے میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ اکٹھا کر لیتے تھے۔
احمد انجینئر تھا۔ ماہانہ تین لاکھ روپے کما رہا تھا۔
ڈاکٹر صاحب سرکاری ہسپتال میں ڈیوٹی دینے کے بعد تین چار گھنٹے کلینک میں بھی بیٹھتے تھے۔ وہ بھی ایک لاکھ سے اوپر ماہانہ کما لیتے تھے۔
عزیر کسی بڑی سرکاری ادارے میں بہت بڑا افسر تھا۔ اچھا خاصا کما لیتا تھا۔
آخر میں میرا نمبر تھا۔ سب مجھے دیکھ رہے تھے اور میں نیچے دیکھ رہا تھا۔
میں مسجد کا امام تھا۔

"آپ سب لوگ اپنا تعارف کرائیں!"

"جی میں مزدور ہوں اور سارا دن محنت مزدوری کرتا ہوں۔"

"میں ڈاکٹر ہوں۔ مریضوں کی خدمت کرتا ہوں۔"

"میں وکیل ہوں مظلوموں کی مدد کرتا ہوں اور ظالموں کو سزا دلواتا ہوں۔"

"میں ایک قاری ہو اور بچوں کو قرآن پڑھتا ہوں۔"

"میں اسکول ٹیچر ہوں اور بچوں کی تربیت کرتا ہوں۔"

"میں صحافی ہوں۔ سچ کو ظاہر اور جھوٹ کو بے نقاب کرتا ہوں۔"

اگلا نمبر میرا تھا۔ سب مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا:

"میں ملک کا بہت مشہور جعلی پیر ہوں۔ بڑی آسانی سے لوگوں کو چونا لگاتا ہوں۔"

مسخرہ

وہ ایک مسخرہ تھا۔
ہنسنا ہنسانا اس کا کام تھا۔ کوئی آ کر اسے تھپڑ مار دیتا اور وہ صرف ہنس کر رہ جاتا۔
کوئی آ کر اسے گرا دیتا وہ ہنسنے لگ جاتا۔
سب جانتے تھے کہ وہ بے ضرر ہے اسی لئے اس کے ساتھ خوب مستی مذاق کرتے۔ کبھی کوئی حد سے آگے بھی نکل جاتا مگر اس کی ساری دولت اس کی ہنسی تھی وہ صرف ہنسنا اور ہنسانا جانتا تھا۔
ایک مرتبہ کا ذکر ہے اس نے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ اس دن اسے پتہ لگا کہ
وہ ہنسنے سے زیادہ اچھا رونا جانتا ہے۔

غریب کا بچہ

چمچماتی گاڑیاں،
کئی مربع زمین اور
کروڑوں روپوں کا مالک حویلی کے صحن میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔
نوکروں کے اچھی خاصی تعداد میرے آس پاس تھی جو میرے
ہر حکم پر "جی سائیں" کہنے کے لئے تیار تھی۔
اسی دوران ایک غریب کسان مجھ سے ملنے آیا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے
لگا:
"سائیں!میری بیٹی کی شادی ہے۔ میری مدد کر دو۔"
اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا ایک مکا میری کمر پر لگا
"چل اوئے جلدی بارہ کا پانا لے آ۔سارا دن سوچتا رہتا ہے۔"
غریب کا بچہ خیالی دنیا سے باہر آچکا تھا۔

فتویٰ

"پاکستان کی آبادی میں پانچ فیصد مسلمان ہیں باقی پچانوے فیصد
غیر مسلم۔"
بابا جی کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا۔
میں نے کہا: "بابا جی! شاید آپ سے غلطی ہوگئی ہے۔ آپ دوبارہ
بولیں۔"
وہ بولے: "پاکستان کی آبادی میں پانچ فیصد مسلمان ہیں باقی
پچانوے فیصد غیر مسلم۔"
میں نے ادب سے کہا: "بابا جی! آپ مطالعہ کریں، کتابیں پڑھیں!
آپ کو ایسی غلط بات نہیں کرنی چاہیے۔"
وہ مسکرا کر بولے:
"تم شاید میرا مطلب نہیں سمجھے۔
یہاں سو میں سے پانچ ہی لوگ ہوں گے جن پر کبھی کفر کا فتویٰ
نہ لگا ہو۔"

حرام

پچھلے دنوں ایک سیاستدان کے گھر کھانے کی دعوت میں جانا ہوا۔
وہاں بڑی بڑی شخصیات موجود تھیں۔
قسم قسم کے کھانے تھے۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کسے
کھاؤں اور کسے چھوڑ دوں؟
میرے ساتھ والی کرسی خالی تھی۔ آس پاس بہت سارے ملازم
کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک کو آواز دی کہ:
"آ جاؤ! ہمارے ساتھ کھا لو۔"
اس نے روایتی صلاء سمجھ کر منع کر دیا۔
میں نے اصرار کیا تو قریب آ کر کہنے لگا:
"معذرت صاحب! یہ عوام کے خون پسینے سے نکلا ہوا ہے ٹیکس
ہے۔
عوام پر حرام ہے۔"

خوشیاں

احمد میرا دوست ہے۔ ویسے تو بہت اچھا ہے مگر اس کی ایک
عادت مجھے بالکل پسند نہیں۔
وہ جب بھی دکان پر جاتا ہے ایک دو چھوٹے چھوٹے کیک خرید
کر کتوں کو ڈال دیتا ہے۔
گوشت خریدنے جاتا ہے تو ایک آدھ پاؤ الگ گوشت لے کر
علاقے کی تین چار بلیوں کو ڈال دیتا ہے۔ میں اسے فضول خرچی
سمجھتا ہوں۔
"تمہیں ایک ایک روپے کی قیمت کا علم ہونا چاہئے۔ بعد میں بہت
پریشانی ہوگی۔"
وہ مسکرا کر بولا:
"میں ان جانوروں کے لیے خوشیاں پیسوں سے خریدتا ہوں۔ مجھے
میری خوشیاں مفت میں مل جاتی ہیں۔

حساب

میرے سامنے ایک ظالم آدمی کھڑا تھا۔ جس نے ہمیشہ سب کو نقصان پہنچایا تھا۔ کبھی کسی کے فائدے کا سوچا بھی نہیں تھا۔

"کتنے لوگ تم سے پریشان ہیں؟

کتنے لوگ تم سے چھٹکارہ چاہتے ہیں؟

کبھی شرم آئی ہے؟

تمہیں ڈوب کر مر جانا چاہیے۔

آج کے دن کا ہی بتادو! آج پورے دن میں کتنے اچھے کام کیے اور کتنے برے کام کیے؟

کاش! تمہاری اچھائیاں زیادہ ہوتیں اور برائیاں کم ہوتیں۔"

وہ بجائے شرمندہ ہونے کے میری نقل اتار رہا تھا۔

روزانہ آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر میں اپنے ضمیر کو حساب دیتا ہوں۔
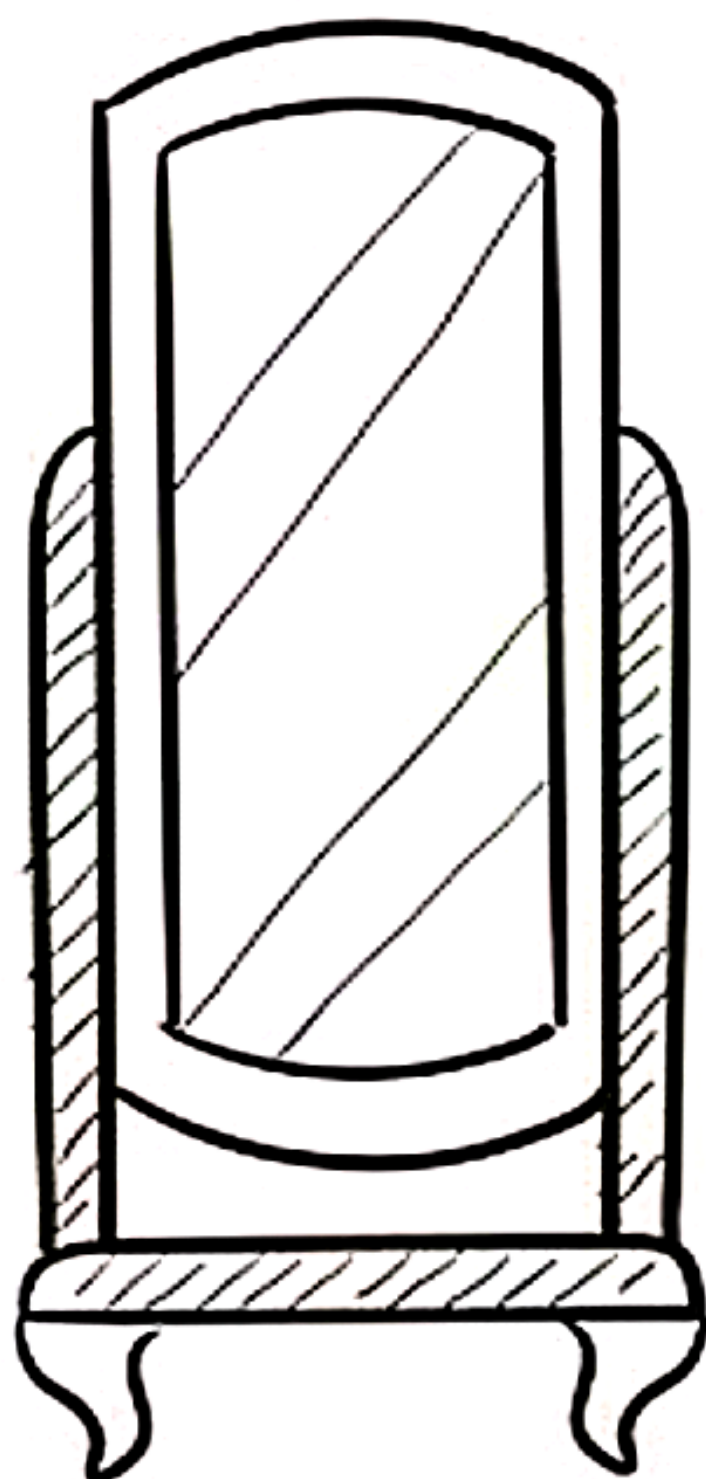
منٹو

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ میں استاد منٹو کا مہمان بنا تھا۔ انہوں
نے خوب مہمان نوازی کی کوشش کی۔
کھانے کے لئے "ٹھنڈا گوشت" دیا میں نے منع کر دیا۔ پینے کے
لئے "برف کا پانی" دیا وہ بھی میں نے واپس کر دیا۔ تحفے کے
طور پر "کالی شلوار" دی وہ بھی میں نے نہیں لی۔

"اب تم ہی بتاؤ! تمہیں کیا چاہیے؟"
میں نے کہا:
"آپ کا قلم۔ جس سے آپ سچائی بیان کرتے ہو۔"
کہنے لگے: "نہیں! سچ بہت کڑوا ہے۔
اگر بیان کرو گے تو دنیا والے تمہارا حشر بھی منٹو جیسا کریں
گے۔"

خوشی

بابا جی کی ساری زندگی خوشیاں بانٹنے میں گزری۔وہ ہر ایک کو
خوش دیکھنا چاہتے تھے۔
کئی یتیم خانے بنوائے۔
کئی مکان خرید کر بے سہارا لوگوں کو دیئے۔
کئی خاندانوں کی کفالت کی۔
ان سے محبت کرنے والے بہت تھے۔ مگر ان سے حسد کرنے
والے دشمن بھی کم نہیں تھے۔
پرسوں بابا جی کا انتقال ہوگیا۔ میں جنازے میں خود بابا جی کو دیکھ
کر حیران رہ گیا۔ مجھے کہا:
"حیران مت ہو! میں بابا جی کی روح ہوں۔ اپنے دشمنوں کے
خوشی دیکھنے آیا ہوں۔
جب تک میں زندہ تھا انہیں خوشیاں نصیب نہیں ہوئیں۔"

جھوٹا

وہ بہت بڑا جھوٹا تھا۔ مشہور تھا اس نے کبھی سچ بولا ہی نہیں
ہے۔
میرے پاس گواہی دینے آیا تو میں نے قسم اٹھانے کا کہا۔ اس
نے قسم اٹھا لی:
"میں قسم کھاتا ہوں کہ جو کہوں گا سچ کہوں گا۔سچ کے سوا کچھ
نہیں کہوں گا۔"
اس نے گواہی دے دی اور فیصلہ بھی ہو گیا۔
تھوڑی دیر بعد میں نے اس سے کہا:
"تم سے ایک بات پوچھتا ہوں سچ سچ بتانا۔
آخری مرتبہ جھوٹ کب بولا تھا؟"
اس نے جواب دیا: "تھوڑی دیر پہلے۔"
جھوٹے نے زندگی میں پہلی مرتبہ سچ بولا تھا۔

زندہ

مجھے سو الفاظ کی کہانی لکھنی تھی۔
اپنی جھولی پھیلا کر عظیم قلم کاروں سے مانگنے نکل پڑا۔
ابوالکلام آزاد "فصاحت" لیے بیٹھے تھے۔ تھوڑی سی میری جھولی میں ڈال دی۔
منشی پریم چند کے سامنے گیا تو انہوں نے "حقیقت پسندی" عطا کر دی۔
بابا اشفاق احمد کے پاس "حکمت" کا ڈھیر تھا۔ انہوں نے بھی سخاوت کا مظاہرہ کیا۔
منٹو نے اپنی "بے باکی" کا کچھ حصہ مجھے بھیک میں دے دیا۔
لکھنے بیٹھا تو ایک ہی جملے کی جگہ بچی تھی۔ میں نے لکھ ڈالا کہ:
"اچھے لکھاری اپنی وفات کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔"

قیمت

چوک پر ایک انسان کی بولی لگ رہی تھی۔
کئی خریدار جمع تھے۔ جو سب سے بہترین قیمت لگائے گا انسان
اسی کو مل جائے گا۔
ایک آواز آئی پچاس ہزار،
پھر آواز آئی ستر ہزار،
پھر آواز آئی اسی ہزار،
اگلی بولی ایک لاکھ کی تھی۔
پھر ڈیڑھ لاکھ، دو لاکھ، تین لاکھ، پانچ لاکھ۔ سارے اسے خرید
کر اپنا غلام بنانا چاہتے تھے۔
اگلی آواز چونکا دینے والی تھی۔ وہی بولی کامیاب ہوئی اور انسان
اسے مل گیا۔ نفرت کے اس دور میں وہی انسان کی صحیح قیمت
تھی۔

وہ قیمت تھی:
"اخلاص اور محبت کے دو بول۔"

پاگل

وہ پاگل تھا۔

بچپن سے اسے میں اسی حالت میں دیکھتا آ رہا تھا۔ ہر وقت وہ ایک ہی جملہ بولتا کہ:

" نہیں! یہ بھی جانور ہے۔"

کوئی اسے پتھر مار کر بھاگ جاتا وہ یہی کہتا کہ

"نہیں! یہ بھی جانور ہے۔"

کوئی اسے دھکا دے کر گرا دیتا وہ یہی کہتا۔

کوئی اس پر ہنستا وہ یہی کہتا۔

ایک دن محلے میں ایک اجنبی آیا۔

اسے پاگل پر ترس آیا۔ وہ اسے ایک ہوٹل پر لے گیا۔ ہاتھ منہ دھلا کر ٹھنڈا پانی پلایا۔ اچھا کھانا کھلایا۔ اور وہ پاگل بے اختیار بول اٹھا:

"ہاں! یہ انسان ہے۔"

ساتھی

سبزی بیچتے ہوئے میں نے ترازو کے نیچے مقناطیس چپکایا تو وہ پہنچ گیا۔
کہنے لگا کہ: "تم غلط کر رہے ہو۔"
گاہک کو پیسے واپس کرتے ہوئے نقلی نوٹ تھمایا تو وہ پھر پہنچ گیا۔
شام کے وقت دوستوں کی مجلس میں غیبت شروع ہوئی تو وہ پھر آ گیا۔
اذان ہوئی اور میں نماز کے لیے نہیں اٹھا وہ یہاں بھی آ پہنچا۔
نماز کے بعد میں نے اسے پکڑ لیا۔
"تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ کب جان چھوڑو گے؟"
کہنے لگا: "جب تک تم زندہ ہو ہم ساتھ رہیں گے۔
ناچیز کو "ضمیر" کہتے ہیں۔"

غریب میرا دوست ہے۔ بے چارہ ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ اس کی زندگی مسائل سے بھری پڑی ہے۔ ایک مسئلہ حل ہوتا نہیں ہے کہ دوسرا آجاتا ہے۔ کبھی کوئی پریشان کرتا ہے کبھی کوئی تنگ کرتا ہے۔

دوست ہونے کے ناطے میں روزانہ شام کو اس سے باتیں کر کے اس کا جی بہلانے کی کوشش کرتا ہوں۔

ایک دن میں نے پوچھا:

"اگر تمہیں تاریخ سے ایک دن مٹانے کا موقع ملے تو کون سا دن مٹاؤ گے؟

کہنے لگا:

"اکتیس دسمبر 1985"

"وہ کیوں؟"

وہ آہ بھر کر بولا:

"اس دن میری پیدائش ہوئی تھی۔"

شکار

بہت بھیانک خواب تھا۔
میں جنگل میں درندوں کے سامنے پڑا تھا۔
خونخوار بھیڑیئے، طاقت ور شیر اور خوفناک چیتوں میں سے کوئی بھی اچانک حملہ کر کے میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا تھا۔اسی دوران میری آنکھ کھل گئی۔
صبح میں اپنے آپ کو پر امن محسوس کر رہا تھا۔مگر جیسے ہی گھر سے باہر نکلا ایک مزید بھیانک منظر میرے سامنے تھا۔
کئی درندے میرے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔کاش! میں اس خواب میں واپس چلا جاتا۔
میں انسانیت کے دشمنوں کا شکار ہو چکا تھا۔
جی ہاں! اب کی بار میں انسانوں کے درمیان تھا۔

وہ چوک پر اپنی گاڑی کی ڈگی سے ٹیک لگائے سرد موسم میں سگریٹ سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ آواز آئی:

"سیٹھ صاحب! دس روپے دے دو۔ کل سے بھوکا ہوں۔"

انہوں نے اس کا سراپا دیکھا اور بولے: "شرم نہیں آتی؟ ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگتے ہو۔" اور دس کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

وہ جانے لگا تو اسے آواز دی: "کہاں جا رہے ہو؟ پانچ روپے واپس کرو!"

بھکاری نے ان کا سراپا دیکھا اور پانچ روپے ان کی ہتھیلی پر رکھ کر بولا:

"مجھ سے زیادہ شرم آپ کو آنی چاہیے۔"

آخری بات

ایک لکھاری کیا چاہتا ہے؟
شاید کسی اور کی سوچ کچھ اور ہو مگر میں دو چیزیں چاہتا ہوں۔ یہی دو چیزیں میری ضرورت بھی ہیں اور میری کہانیوں کی کل قیمت بھی ہیں۔
پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا پیغام زیادہ سے زیادہ پھیلے۔ اگر ایک ہزار لوگوں تک بھی میرا پیغام پہنچ جائے تو ہوسکتا ہے ان میں سے کسی ایک کا نظریہ بدل جائے۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔
اور دوسری بات یہ ہے کہ میں اچھا لکھ رہا ہوں یا نہیں؟ میرا انداز مؤثر ہے یا نہیں؟ اس بارے میں آپ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔
آپ کے رائے دینے سے نہ صرف میری حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ میری غلطیوں کی بھی اصلاح ہوگی اور بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔
امید ہے آپ ان دونوں باتوں میں مجھ ناتواں سے تعاون فرمائیں گے۔

آپ کے تعاون کا منتظر

سیف الرحمن ادیب

saifurrahmanadeeb@gmail.com
https://www.facebook.com/soalfazkikahani/

اُس کے نام